بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

# نظرات

معاصر محترم "طلوع اسلام" کو دستور پاکستان کی اس شق پر اعتراض ہے جس میں کہ اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ "مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا" اس سلسلے میں معاصر کا یہ کہنا ہے کہ کتاب تو سب کے نزدیک متعین و معروف ہے، لیکن سنت غیر معین اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان وجہ نزاع۔ اس لئے بقول معاصر ہر نئے قانون پر بحثیں انفرادی طور پر چلتی رہتی ہیں اور ملک خلفشار کی نذر ہوتا رہتا ہے۔ "طلوع اسلام" نے اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سنت کی وضاحت کریں۔

ماہ جون کے "فکر و نظر" میں معاصر کے اس مطالبے کے بارے میں کچھ عرض کیا گیا تھا۔ ہم نے لکھا تھا کہ "سنت" بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک "مثالی اسوہ" کے، سب مسلمان فرقوں کے ہاں مسلّم ہے۔ اور یہ کہ قرآن میں مذکورہ احکام کو ان کے صحیح موقع و محل میں رکھ کر ہی ان سے آئندہ کے لئے قانون سازی میں رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے "سنت" کا وجود لازمی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر "سنت" سے کاملاً قطع نظر کر لیا جائے، اور قانون سازی میں صرف قرآن پر انحصار کیا جائے تو اس سے قانون سازی میں آسانی ہو گی، صحیح نہیں۔ کیونکہ "جن معنوں میں بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن ہمیں اصول دیتا ہے، اس طرح تو قرآن میں کہیں اصول نہیں ہیں۔ البتہ اس میں جگہ بہ جگہ یقیناً بعض عمومی احکام ملتے ہیں۔ اب قرآن سے اصولوں کو اخذ کرنے کے لئے ان عمومی احکام کو ان سے متعلقہ احوال و کوائف کے پس منظر میں رکھنا پڑے گا۔ نیز قرآن میں کسی تیار شدہ قانون کا وجود نہیں ہے کہ اسے وہاں سے چپکے سے اٹھا کر آج کی زندگی کے ساتھ پیوند کر دیا جائے۔ اس کے لئے تو اخذ و استنباط کا طریقہ اختیار کرنا

ہوگا۔ یعنی پہلے ہر قرآنی حکم کو اس موقع و محل میں دیکھا جائے، جس میں یہ حکم صادر ہوا۔ اس کے لئے لازماً "سنت" کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس حکم سے اصول اخذ کیا جائے اور اس کے بعد اس اصول کا موجودہ حالات پر اطلاق ہو۔ اسی صورت میں اسلامی قانون اپنے صحیح معنوں میں ہمیں ملے گا۔"

---

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اکثر اسی طریقے پر عمل ہوتا رہا۔ اس بارے میں پچھلے دنوں "فکر و نظر" میں مولانا مفتی امجد العلی کا ایک سلسلۂ مضامین بعنوان "تشکیل قوانین اسلامی کے تاریخی مراحل" شائع ہوا ہے۔ اس ضمن میں ایک جگہ مفتی صاحب لکھتے ہیں:- ..... "ان حضرات (صحابہ و تابعین و تبع تابعین) کا ایمان یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ عظیم حکمت والے نے جو احکام ہمارے لئے تجویز فرمائے ہیں، وہ تمام تر ہماری مصلحتوں کے لئے ہیں، جن سے مقصود یا تو کسی خیر کا حصول یا کسی شر کا دفع کرنا ہے ..... اس یقین کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ یہ حضرات ان علل و مقاصد کی اس حد تک جستجو کریں، جو اس کا حق ہے تاکہ رونما ہونے والے واقعات میں شرعی حکم تک پہنچ سکیں۔"

مفتی صاحب نے شواہد کے طور پر اپنے مضمون میں اس کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور مثال حضرت عمرؓ کا عراق و شام کی مفتوحہ اراضی کا مجاہدین میں تقسیم کرنے سے انکار تھا، حالانکہ قرآن کی بعض آیات اور خود عمل نبویؐ اس تقسیم کے حق میں تھا۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:- ..... "غرض اس معاملے میں حضرت عمرؓ نے ایک رائے قائم فرمائی، جو بظاہر کتاب و سنت دونوں کے مخالف تھی اور جو ان کی رائے کے مخالف تھے، ان صحابہ کے قول کے قرآن و سنت (بظاہر) دونوں واضح طور پر موافق تھے"..... آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے قول کی تائید میں یہ آیت پیش کی۔" اور جو لوگ ان سب کے بعد آئیں گے، کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے سابق الایمان بھائیوں کو بخش دے۔ اور ایمان والوں کے لئے ہمارے دلوں میں کھوٹ نہ پیدا فرما۔"

صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے کی اس آیت سے براہ راست تائید نہیں ہوتی، اور پھر یہ کہ ان کے سامنے خیبر کی اراضی کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ صلعم کا عمل بھی موجود تھا، لیکن مفتی امجد العلی کے الفاظ میں "عامۃ المسلمین کی مصلحت کے پیش نظر انھوں نے اس پر کفایت نہ کی اور نہ یہ خیال کیا کہ آنحضرت صلعم کا وہ عمل دائمی طور پر مابعد کے لئے قطعی فیصلہ ہے۔"

اسی قسم کی ایک اور مثال حضرت عمرؓ کا سرقے کی حد کو ساقط کرنا ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے مضمون میں

اس پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے جامعہ عین الشمس قاہرہ کے شعبہ قانون اسلامی کے صدر کا ایک اقتباس دیا ہے، جس کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

"آپ (حضرت عمرؓ) کا فیصلہ (حاطب کے غلاموں کے اونٹنی چرانے پر ہاتھ نہ کاٹنا) ایک مشہور فیصلہ ہے۔ اس سے یہ یقین ہوگیا کہ تشریعی احکام ایسی علتوں پر مبنی ہوتے ہیں، جو ان احکام کی مقتضی ہوتی ہیں اور ایسے مقاصد پر جو احکام کی راہبری کرتے ہیں۔ اور ظاہر کے ترک کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہی وہ چیز تھی جس کو صحابہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے فقہاء نے سمجھا تھا۔"

آج ہمیں موجودہ اور نئے پیدا ہونے والے حالات کے لئے جو قانون سازی کرنا ہے تو اس کے لئے ہمیں لازماً قرآن سے اوپر کے طریقے پر اصول اخذ کرنا ہوں گے۔ اس کے بعد اپنی ضروریات و حالات پر ان اصولوں کے عملی انطباق سے ہماری اسلامی مملکت کے قوانین تشکیل پذیر ہوں گے۔ قرآن پاک سے ایسے اصولوں کے استنباط کے لئے "سنت" یعنی رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے "اسوۂ حسنہ" کا واسطہ ضروری ہے۔ اور اس واسطے کے بغیر ہمارے نزدیک قرآن کو پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے مندرجہ احکام سے اصول عامہ کا اخذ کرنا تو ایک طرف رہا۔

کتاب و سنت کو قانون سازی کے لئے مدار علیہ قرار دینے کے بارے میں یہ ہے موقف ادارہ تحقیقات اسلامی کا۔ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن بارہا ادارہ کے اس موقف کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ چونکہ ہر اسلامی فرقہ "سنت کی اپنی اپنی تعبیر کرتا ہے۔ اس لئے اس سے قانون سازی میں تعطل پیدا ہوگیا ہے، اور بعض اغراض پرست جماعتیں اس سے غلط فائدہ اٹھا رہی ہیں، تو اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ بے شک "سنت" کی تعبیر میں فرقوں میں اختلاف ہے، لیکن سب کا اس پر تو اتفاق ہے کہ "سنت" نام ہے رسول اللہ صلعم کے اپنے عمل اور اس عمل کا، جس سے آپؐ راضی تھے۔ ہاں اس ضمن میں اگر اختلاف ہے تو اس سنت کی روایت کے متعلق ہم نے اس سلسلے میں جون کے "فکر و نظر" میں لکھا تھا کہ اس اختلاف کو دور ہونا چاہیئے۔ اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ تمام فرقوں میں جو مابہ الاتفاق امور ہیں، ان پر زور دیا جائے، اور مابہ الاختلاف مسائل کی ایسی توجیہ ہو، کہ اس سے باہمی کدورتیں ختم ہوں، ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ متعدد

اسلامی ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے، اور وہ اپنے ہاں نئے قوانین کے لئے مآخذ کے طور پر تمام مسلمان فرقوں کے مذاہب فقہ سے استفادہ کر رہے ہیں۔ خود پاکستان میں ہائی کورٹ کے بعض ججوں نے اپنے فیصلوں میں اس کی صراحت کی ہے کہ ہمیں صرف ایک مذہب فقہ کا پابند نہیں رہنا چاہیئے۔ خلع کے مشہور مقدمہ میں جسٹس کیکاؤس نے جو تاریخی فیصلہ لکھا ہے، اس میں ایک جملہ یہ ہے"۔۔۔۔ قاضی کو یہ اختیار ہے کہ اگر کسی مقدمہ کے فیصلے کے لئے ضروری سمجھے تو اپنی مخصوص فقہ کے حکم کے بجائے کسی دوسرے مکتب قانون کی پیروی کرے (ملک محمد جعفر ایڈووکیٹ کا ایک مضمون اسی موضوع پر "فکر و نظر" میں چھپ رہا ہے۔"

---

معاصر "طلوع اسلام" نے اگست کے شمارے میں پھر اسی بحث کو چھیڑا ہے۔ جہاں تک ان امور میں ہمارے موقف کا تعلق ہے، وہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ معاصر نے اس ضمن میں جو سوالات اٹھائے ہیں آئندہ سطور میں ہم ان کا مختصراً جواب دیتے ہیں۔

(۱) معاصر نے پہلے لکھا تھا کہ قرآن ایک متعین و معروف کتاب ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں عرض کیا تھا کہ بے شک جہاں تک قرآن کے متن کا تعلق ہے، ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہے، لیکن اس متن کی تشریح و تعبیر میں شروع سے اختلاف رہا ہے۔ اسی لئے ہر عہد میں قرآن کی لاتعداد تفسیریں لکھی گئیں، اور خود صاحب "طلوع اسلام" کو بھی اپنی تفسیر لکھنی پڑی، بلکہ انھوں نے تو نئی لغات القرآن مرتب کی ہے، جس میں قرآن کے الفاظ کے نئے معانی اور مفہوم متعین کئے گئے ہیں۔

معاصر نے ہماری اس عرضداشت کا جواب یہ مرحمت فرمایا: "ہم ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر قرآن کی پوزیشن یہی ہے کہ اس کے متن کا متفق علیہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا، کیونکہ "اس متن کی تشریح و تعبیر میں شروع سے اختلاف رہا ہے"۔ تو دستور پاکستان میں جو یہ کہا گیا ہے کہ" ملک کا کوئی قانون قرآن کے خلاف نہیں ہوگا" تو اس کا عملی مفہوم اور فائدہ کیا ہے ؟ کیا یہ محض اشک شوئی۔۔۔۔ ہے۔"

یہاں معاصر سے ہم نے جو عرض کیا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ جو کچھ عرض کیا گیا تھا، کیا وہ واقعہ نہیں ہے اور خود صاحب "طلوع اسلام" کا اپنی تفسیر لکھنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ امت میں قرآن کی تشریح و تعبیر میں اختلاف رہا ہے۔ اب بھی ہے، اور خود صاحب موصوف نے بھی عملاً اسے ثابت کر دیا ہے۔

معاصر نے اپنے اسی مضمون میں ارشاد فرمایا ہے:۔ "اگر کوئی مملکت اپنے ہاں قرآنی قوانین نافذ کرنا چاہے

تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ قرآن کریم کے متن کو سند و حجت قرار دے۔ انسانوں کی کسی تعبیر و تشریح کو یہ درجہ نہ دے۔ پھر اربابِ علم و بصیرت پر مبنی ایک مشینری متعین کرے، جو قرآن پر غور و فکر کے بعد اس کے احکام و اصول کا مفہوم متعین کرے۔ اس مفہوم کے مطابق جو قوانین اس مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے، وہ اسلامی قوانین کہلائیں گے۔"

یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ جیسا کہ علامہ اقبال نے لکھا ہے :۔ "قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔ اس کا حقیقی منشا یہ ہے کہ ذہنِ انسانی میں اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالقِ کائنات سے ہے، اعلیٰ اور بہتر شعور پیدا کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک میں قانونی نوعیت کے کچھ عام اصول اور قواعد و ضوابط موجود ہیں . . . ." علامہ اقبال قرآن میں ان کی موجودگی کی ضرورت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :۔ "لیکن پھر اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمحِ نظر ہے، جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کی بجائے حرکت پر رہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمحِ نظر ایسا ہوگا، اس کی روش ارتقا کے خلاف کیسے ہوسکتی ہے؟ . . . ." اس سے کچھ آگے علامہ لکھتے ہیں :۔ "پھر جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں، جن پر قرآن مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے، تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان سے نہ تو فکرِ انسانی پر کوئی روک قائم ہوتی ہے، نہ وضعِ آئین و قوانین پر۔ برعکس اس کے، ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے، اس سے ہمارے غور و فکر کو اور بھی تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی اصول تھے، جو فقہائے متقدمین کے پیشِ نظر تھے، اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے متعدد نظاماتِ قانون قائم کئے . . . ."

سوال یہ ہے کہ قوانین سازی کے لئے قرآن کے متن کو سند و حجت قرار دینے کے کیا معنی ہیں؟ مان لیا کہ اسے سند و حجت قرار دے دیا گیا تو اس کے متن کی تعبیر و تشریح تو آخر انسانی ہی ہوگی۔ خود قرآن تو ناطق نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن پر غور و فکر کرنے والے اربابِ علم و بصیرت بذریعہ نص تو مقرر نہیں ہوں گے کہ قرآن کے احکام و اصول کا ان کا متعین کردہ مفہوم معصوم مان لیا جائے۔ ان اربابِ علم و بصیرت میں اگر اختلافِ رائے ہوگا، تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں کی تعبیر انسانی ہے اور فلاں کی قرآنی۔ قرآن کے بارے میں اللہ کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے "ولو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً" لیکن اس پر غور و فکر کرنے والے "اربابِ علم و بصیرت" اگر خود آپس میں مختلف فیہ ہوں، اور قرآن سے اخذ کردہ احکام و اصول کے بارے میں ان میں اختلاف ہو، تو اس بارے میں حَکَم کون ہوگا؟

اس ضمن میں معاصر کا یہ پوچھنا "۔۔۔۔ تو اس کا عملی مفہوم اور فائدہ کیا ہے"؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کے لئے قرآن پر اس طرح تدبر کر کے اس سے اصول اخذ کرنا ہوں گے، جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں۔

(۲) معاصر کا ارشاد ہے :۔ "اپریل ۱۹۶۸ء کے فکر و نظر میں یہاں تک لکھ دیا تھا :۔ " احکام و مسائل کا استخراج نصوص پر مبنی تھا۔ یہ نصوص شارع علیہ السلام سے لے کر آخر تک عربی زبان میں تھیں۔ اور عربی زبان کے الفاظ بیک وقت متعدد اور متضاد معنوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ ابن خلدون کے ہیں اور مفتی امجد العلی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، ان کا حوالہ دیا ہے۔ ابن خلدون کی عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے :۔" اور سلف ان ادلّہ سے مسائل کا استخراج مختلف احکام کی شکل میں کرتے۔ اور اس اختلاف کا ان کے درمیان واقع ہونا ایک لازمی امر تھا۔ کیونکہ احکام کے دلائل زیادہ تر نصوص شرعیہ ہوتیں اور یہ بکلہ عربی زبان میں تھیں۔ اور ان نصوص کے الفاظ بہت سے معانی کے مقتضی تھے۔ اور اس بارے میں ان کا اختلاف مشہور ہے۔"

معاصر نے "فکر و نظر" میں ابن خلدون کے اس حوالے کے اندراج پر یوں عتاب فرمایا ہے :۔" ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرح) ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ارباب فکر و نظر بھی قرآن کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔" اس کے بعد ارشاد گرامی ہے :۔" ہماری بصیرت کے مطابق صورت یہ ہے کہ (۱) قرآن کریم کے کسی حکم یا اصول کے دو متضاد معانی ہو نہیں سکتے۔۔۔۔"

محولہ بالا جملے میں "نصوص کے الفاظ" کا ذکر ہے کہ وہ "بہت سے معانی کے مقتضی ہیں۔" لیکن معاصر نے الفاظ کو حکم یا اصول میں تبدیل فرما دیا۔ ہم معاصر سے پوچھتے ہیں کہ کیا نصوص کے الفاظ کے ایک سے زیادہ معانی نہیں ہیں؟ اگر نہیں تو انھوں نے جو قرآن کے الفاظ کے معانی کئے ہیں، کیا دوسروں نے بھی یہی معنی کئے ہیں۔ یہاں سوال الفاظ کا ہے۔ اور ابن خلدون نے انہی کا ذکر کیا ہے۔

(۳) معاصر رقم فرماتا ہے :۔" جب اسلامی نظام مملکت باقی نہ رہا۔۔۔۔ امت میں اس قسم کے عقائد پھیلا دیئے گئے کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے، حتیٰ کہ اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔۔۔۔" ہم اس بارے میں علامہ اقبال کی رائے جنہیں معاصر یقیناً اپنا مقتدا مانتا ہے، معاصر کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ مرحوم ایک مستشرق معترض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔" میرے خیال میں مصنف کو جو غلط فہمی ہوئی، لفظ "نسخ" سے ہوئی، جسے فقہائے متقدمین نے استعمال تو کیا ہے مگر جس کا مطلب جیسا کہ امام شاطبی نے موافقات

میں تصریح کر دی ہے، یہ ہے کہ اجماعِ صحابہ کے سلسلے میں اس سے مراد ہے کسی حکم قرآنی کی توسیع یا تحدید۔ یہ نہیں کہ ہم اس کو نظر انداز یا منسوخ کر دیں" جیسا کہ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے اس زمانے کے حالات کے پیش نظر مصارفِ زکوٰۃ میں سے 'مؤلفۃ القلوب' کو خارج کر دیا تھا، لیکن حالات بدلنے پر انہیں دوبارہ شامل بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض دوسرے احکام میں بھی ایسا ہوا۔

دہم "فکر و نظر" بابت جون میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا دستور پاکستان میں "کتاب" کے ساتھ "سنت" کے لزوم کے سلسلے میں یہ اقتباس دیا گیا تھا:" ..... سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلعم کی تیئس سالہ جدوجہد قرآن سے پوری طرح مربوط ہے۔ آخر قرآن کا نزول کوئی خلا میں تو نہیں ہوا۔ وہ آپؐ کی طویل جدوجہد کے دوران برابر آپؐ کی رہنمائی کرتا رہا۔ اس لئے ایک کو دوسرے سے الگ کرنا نہ صرف ناممکن ہے، بلکہ یہ غیر مستحسن بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر، جس میں کہ رسول اللہ صلعم مصروفِ عمل رہے، اکیلے قرآن کا مطالعہ ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں آپؐ کا عمل اتنی ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس قدر کہ قرآنی احکام۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل ہے، جسے سنت یا آپؐ کا اسوۂ حسنہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی کی روشنی میں ہم قرآن سمجھ سکتے اور اپنی روزمرّہ کی زندگی نیز قانون سازی کے لئے اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس پر معاصر ارشاد فرماتا ہے :۔ "لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ "پس منظر" متفق علیہ طور پر ملے گا کہاں سے؟ اسی پس منظر کا اختلاف ہی تو ہے، جس سے سنت رسول اللہؐ کا کوئی متفقہ علیہ مجموعہ مرتب نہ ہو سکا ہے، نہ ہو سکے گا۔ "روایات" کو "پس منظر" کہہ دینے سے مشکل حل نہیں ہو سکتی۔"

ہم معاصرؐ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ "پس منظر" متفق علیہ طور پر ملا نہیں کرتے۔ اس کی ماضی کی روایات ہی میں تلاش کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے عمومی اصولِ تنقید وضع کرنا پڑتے ہیں، اور ان کو کسوٹی بنا کر ہی حتی الوسع متفق علیہ "پس منظر" ہاتھ آتا ہے۔ تاریخ میں یہی ہوتا ہے، دوسرے علوم میں بھی یہی طریقہ کار ہے۔ یہ کہہ دینے سے کہ سب روایات عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ آسانی ضرور ہو جاتی ہے کہ آدمی ان روایات کے مطالعہ کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ لیکن اس سے نہ اُس علم میں "نظر" پیدا ہوتی ہے۔ نہ اس کی "خبر" کا احاطہ ہوتا ہے۔ ہر فکر کی ایک تاریخ ہوتی ہے، اور اس کی تاریخ سے اسے الگ کر کے اس پر حکم یا حرفِ آخر بننا زعم باطل سمجھا جاتا ہے۔ اس "پس منظر" کے لئے عرب قبل از اسلام کی تاریخ پڑھنا ہوگی۔ سیرت نبویؐ کا بالتفصیل مطالعہ کرنا ہوگا۔ احادیث کے

سلہ مراد ہے ماہنامہ طلوع اسلام - ... سیارہ

مجموعوں کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ پھر اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فقہ و حدیث و تفسیر کا جس طرح ارتقا ہوا، اس کے مشمولات و محرکات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ بے شک یہ کام مشکل ہے۔ اور " فوق کل ذی علم علیم" کے مصداق ایک سے ایک ان میں ماہر ملیں گے۔ ضرورت ان سب سے استفادہ کرنے اور انہیں پرکھنے کے لئے تنقیدی بصیرت بہم کرنے کی ہے۔

علامہ اقبال نے "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں حدیث کی بحث میں اسی قسم کے تنقیدی مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا ہے :- لکھتے ہیں :-

"۔۔۔۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی، تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی، جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کئے ہیں۔ پھر یہ اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے، جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی مآخذ کی از سر نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں۔" بے شک بقول علامہ اقبال " اندریں حالات اگر آزادئ اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیائے اسلام میں پھیل رہی ہے، احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا مآخذ تسلیم کرنے کو تیار نہیں" تو ان کے نزدیک "اس سے اہل السنت والجماعت کے ایک امام الائمہ (امام ابو حنیفہ) کی پیروی مقصود ہے"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں :-

"بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی سرانجام دی، یہ ہے کہ انھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کی بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔"

اگر محترم صاحب "طلوع اسلام" بُرا نہ منائیں تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ انھوں نے احادیث کا بلکہ اسلام کی پوری علمی تاریخ کا بالکلیہ انکار کر کے (خواہ وہ اس انکار کی کوئی بھی تعبیر کریں) اپنے آپ کو مجرد غور و فکر کے دھارے کے حوالے کر دیا ہے۔ جس کا کہ کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔ ایک ساحل کو تو بے شک انھوں نے چھوڑ دیا۔ لیکن دوسرا ساحل نہ ان کو ملا ہے، اور نہ کبھی ملے گا۔ کیونکہ مجرد فکر کا یہی مآل ہوتا ہے۔ انسان جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں :- "ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں وہ اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔" اور دراصل اپنے معاشرے کے لوازم و حقائق سے اسی کی وجہ سے اس کا ذہنی و عملی ربط قائم رہ سکتا ہے۔ اس سے کچھ آگے

اقبالؒ اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں :-

"زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اُٹھائے آگے بڑھتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں۔ تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے، جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ لینا ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم اپنی ماضی کا انکار نہیں کرسکتی، اس لئے کہ یہ ان کا ماضی ہی تھا، جس سے ان کی موجودہ شخصیت متعین ہوئی ....."

علامہ اقبال نے جہاں احادیث کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر زور دیا ہے، وہاں وہ فقہ کی تدوین کے سلسلے میں فقہائے متقدمین کی کوششوں کو سراہنے کے بعد فقہ اسلامی کی بحث میں بھی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

دورِ حاضر کے مغربی ناقدین نے بھی اسلام کے بارے میں جو نظریات قائم کئے ہیں، ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے جیسے مسلمانوں میں زندگی کو تقویت پہنچے گی، اسلام کی عالمگیر روح فقہاء کی قدامت کے باوجود اپنا کام کرکے رہے گی۔ مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ جونہی فقہِ اسلام کا مطالعہ غائر نظروں سے کیا گیا، اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشو و نما کے ناقابل ہے۔"

بے شک اقبالؒ نے اپنے ملک کے قدامت پسند مسلم عوام کی اس روش پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ وہ فقہ اسلامی میں کسی تنقیدی نقطۂ نظر کو برداشت نہیں کرتے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اب تک یہ صورت حال ہے۔ لیکن بہت سے اسلامی ملکوں میں یہ فقہی جمود ٹوٹ رہا ہے! اسلام کے عہد ماضی کے مجموعہ ہائے حدیث و فقہ کے بارے میں یہ رائے ہے علامہ اقبال کی۔ اس کے برعکس صاحبِ "طلوع اسلام" ان دونوں کے متعلق جو لکھتے ہیں، وہ یہ ہے :-

جب اسلامی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تو قرآنی مفہوم انفرادی طور پر لیا جانے لگا اور وہ اس طرح کہ قرآن کو تابع کر دیا گیا (پہلے) روایات کا اور (پھر) فقہ کا۔

---

"طلوع اسلام" نے لکھا تھا :- "جہاں تک فرقوں کا تعلق ہے، قرآن کریم بہ نص صریح اسے شرک قرار

دیتا ہے اور یہ کہ دین میں فرقوں کا وجود خدا کے نزدیک شرک ہے اور اس کے رسول کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔" ہم نے اس کے جواب میں جو عرض کیا تھا، وہ یہ ہے:۔

"بے شک ہمارے ہاں فرقے ہیں۔ اس سے انکار کرنا عین دوپہر کو آفتاب کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ ان فرقوں کا قرآن پر ایمان ہے، لیکن اس کی تفسیر وہ اپنے معتقدات کے مطابق کرتے ہیں، جن کی کہ ایک طویل تاریخ ہے۔ اسی طرح وہ سنت کو مانتے ہیں، لیکن اس کی روایت اور اس کی حدود ہر ایک کی جدا جدا ہیں۔ یہ کہہ دینے سے کہ فرقوں کا وجود قرآن کی نص صریح کی رو سے شرک ہے، فرقے تاریخ اسلام میں اپنی جڑوں کے ساتھ محو نہیں ہو سکتے۔ وہ صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں رہیں گے۔ اس حقیقت واقعی کا انکار اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔"

ان فرقوں کی آپس کی مناقشت اور بعض حالات میں ان میں جو باہمی تباغض و تحاسد پایا جاتا ہے، اسے دُور کرنے کی ضرورت پر ہم نے زور دیا تھا، لیکن اس ضمن میں لکھا تھا:۔

"یہ مقصد دستور میں صرف "کتاب" کے اثبات اور "سنت" کی نفی سے حاصل نہیں ہوگا۔ مسلمان فرقے "سنت" کو "کتاب" کے ساتھ رکھ کر بھی متحد ہو سکتے ہیں اور ان میں صرف "کتاب" پر بھی (یعنی اس کی تعبیرات میں) مستقل نزاع رہ سکتا ہے۔"

اور اپنی اس رائے کی تائید میں ہم نے دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کی مثال دی تھی کہ یہ دونوں حنفی ہیں۔ دونوں تقلید کے حامی ہیں۔ دونوں کے مسلمات ایک ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں میں اتنا اختلاف ہے کہ کسی حنفی اور غیر حنفی میں نہیں ہوگا۔

معاصر نے اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے سب سے پہلے تو ہماری طرف ایک ایسی بات منسوب کی، جو ہم نے سرے سے کہی ہی نہیں تھی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"طلوع اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ "فکر و نظر" کو اس سے انکار نہیں، لیکن وہ کہتا یہ ہے ......"

اس ضمن میں ہمارے الفاظ یہ تھے:۔ "یہ کہہ دینے سے کہ فرقوں کا وجود قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے، فرقے تاریخ اسلام میں اپنی گہری جڑوں کے ساتھ محو نہیں ہو سکتے۔" لیکن ہمارے اس جملے کے معنی معاصر نے یہ لئے ہیں کہ "اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے، "فکر و نظر" کو اس سے انکار نہیں۔" یہ کسی اعتبار سے صحیح

نہیں۔ بے شک ہم نے اس موقع پر معاصر کے اس دعویٰ کی، کہ فرقوں کا وجود بہ نصِ صریح شرک ہے، تردید نہیں کی، کیونکہ اُس وقت مسئلہ زیرِ بحث دوسرا تھا، لیکن اس سے پہلے ہم اس کی صراحت کر چکے تھے کہ ہر فرقے کا مدار علیہ قرآن ہے اور اس پر اس نے اپنی فقہ اور حدیث و سنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد معاصر یوں رقم طراز ہے:۔

" یعنی بات یوں ہوئی کہ

(۱) اسلام میں فرقے قرآن کی رُو سے شرک ہیں۔

(۲) لیکن امت میں فرقے موجود ہیں اور صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

(۳) یہ آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہیں گے۔

لہٰذا اب ایسا اسلام تلاش کرنا، جس میں شرک نہ ہو، حماقت ہے۔ ہمیں اس قسم کے شرک آلود اسلام کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کس قدر مایوسانہ تصوّر ہے . . . . "

معاصر نے یہ سب نتائج ہمارے ایک جملے سے نکالے جس کے عمداً یا ممکن ہے سہواً غلط معنی لئے گئے ہیں۔ معاصر نے "فکر و نظر" کے اس ایک جملہ کو غلط معنی پہنا کر اس کی طرف یہ منسوب کیا ہے :۔ "آپ نے دیکھا کہ یہ اسلام کے مستقبل کی طرف سے کس قدر مایوسانہ تصوّر ہے"! حالانکہ "فکر و نظر" کے اسی مضمون کے آخر میں جس سے یہ جملہ نقل کیا گیا ہے، مسلمان فرقوں کے اتحاد کے متعلق حسب ذیل توقع کا اظہار کیا گیا تھا:۔

" ہمارے خیال میں عالمی اسلامی فکر اسی سمت (سب فرقوں کی "سنتوں" کی مدد سے "عملِ" رسُولؐ کا صحیح تعین۔ پھر اس "عملِ" رسولؐ کا اُس عہد کے حالات و کوائف کے پس منظر میں صحیح صحیح جائزہ اور اس سے عمومی اصولوں کا اخذ کرنا) کی طرف جا رہا ہے۔ خانہ کعبہ میں صدیوں سے چار مذاہب فقہ کے الگ الگ مصلّے چلے آتے تھے۔ عرصہ ہوا یہ مصلّے ختم کر دیئے گئے۔ اہل سنت کے چاروں مذاہب فقہ میں دیرینہ چپقلش چلی آتی تھی۔ ایک مذہب والے دوسرے مذہب کے خلاف کتابیں لکھ لکھ کر نہ تھکتے تھے۔ لیکن اب کافی دنوں سے بہت سے اسلامی ملکوں میں جو نئے قوانین مرتب ہو رہے ہیں، ان میں چاروں مذاہبِ فقہ سے یکساں طور پر مدد لی جاتی ہے۔ اور بتدریج یہ تمیز مٹتی جا رہی ہے کہ ان میں آپس میں کبھی منافرت بھی تھی"۔

اس کے بعد عرض کیا گیا تھا۔ " بلکہ اب تو کئی مسلمان ملکوں میں یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ نئے قوانین کے ماخذ

کے طور پر صرف چاروں مذاہبِ فقہ پر انحصار کیا جائے، بلکہ دوسرے مسلمان فرقوں مثلاً اثنا عشریہ، زیدیہ، اسماعیلیہ اور اباضیہ کی فقہوں کو بھی مآخذ بنایا جائے۔"

ہم نے لکھا تھا کہ فقہ میں "تقریب بین المذاہب الاسلامیہ" کا یہ عمل لازماً اور آگے بڑھے گا چنانچہ:۔

"فقہ کے بعد سنت میں متفق علیہ مبادی کی تلاش ہوگی اور اگر قلب و نظر کی وسعت اور تحقیق و تنقید کا رجحان اسی طرح رہا تو مختلف "سنتوں" کی مدد سے "عملِ" رسولؐ کا صحیح تعین بھی مشکل نہیں رہے گا۔ مختلف فرقوں کا اتحاد اسی صورت میں ہوگا۔ اور مسلمان قرآن اور رسول اللہ صلعم کی حقیقی عظمت اسی طرح پہچان سکیں گے۔"

جون کے "فکر و نظر" کے اس مضمون (نظرات) کا آخری جملہ یہ تھا:۔

"مسلمان قومیں جس طرح (اس راہ میں) آگے بڑھ رہی ہیں، اُن کا یہ عمل ہی "سنت" کے مفہوم کا تعین کرے گا۔ اور اسی طرح فرقوں کی باہمی منافرت ختم ہوگی۔"

کیا یہ اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوسانہ تصوّر ہے، جس کا الزام معاصر نے "فکر و نظر" کو دیا ہے۔ یا اسلام کے مستقبل کا ایک متحد، ترقی کرنے والا اور بامِ عروج پر پہنچنے والا تصوّر۔

---

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا، قرآن کا متن متعین ہے، لیکن اس متن کے مفہوم کی تعبیر و تشریح میں اختلاف رہا ہے اور اب بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "سنت" گو سب مسلمان فرقوں کے نزدیک "عملِ" رسولؐ سے عبارت ہے لیکن اس کی حدود اور تعبیرات میں اختلاف ہے۔ اب "طلوع اسلام" کا یہ مطالبہ کہ "سنت" کا مفہوم متعین کیا جائے، تو اس ضمن میں ہم یہ کہیں گے کہ ایسے ہی قرآن کے متن کی تعبیرات میں بھی ایک متفق علیہ مفہوم متعین کرنا ہوگا۔ یاد رہے کہ سنت اور قرآن کے مفہوم کے تعین کا یہ ذکر قانون سازی اور صرف قانون سازی کے ضمن میں کیا جا رہا ہے۔

اس بارے میں جو ڈاکٹر فضل رحمٰن کی رائے ہے، وہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

خلفائے راشدین کے دَور میں جو اسلامی دستور وجود میں آیا، اس کی بنیاد قرآن حکیم اور رسول اکرمؐ کی سنت (جس کی تعداد زیادہ نہ تھی) تھی۔ اب ظاہر ہے ہر عہد میں قرآن اور سنت کی ترجمانی کی ضرورت ہے۔ اور یہ اہم عنصر اجماع ہے، جو اس ترجمانی کا معتبر حامل رہا ہے۔ آج اس دَور میں اجماع مختلف مکاتبِ

فکر میں رجوانِ مسائل پر رائے دینے کی اہلیت رکھتے ہوں) اور عام پبلک میں افکار و آرا پر آزادانہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ انعقاد پذیر ہو سکتا ہے۔ یہ اجماع ایک طرح کی رائے عامہ ہے، جو مجتہدانہ نظر رکھنے والے لوگوں کی فکری قیادت میں پیدا ہوتی ہے۔ قانون ساز اسمبلی پیش نظر مسائل پر بحث و مباحثہ کر کے ان کے بارے میں رائے عامہ کی اجماعی صورت کو (جو اسمبلی کے باہر ہوگی) قانونی جامہ پہنائے گی۔ وہ متنازعہ فیہ مسائل جن کے متعلق شک ہو کہ آیا کہ وہ اسلام کی روح یعنی قرآن و سنت کے منشاء کے مطابق ہیں یا نہیں، ان کے بارے میں رائے عامہ سے استصواب کیا جا سکتا ہے، اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ان امور میں آخری و حتمی فیصلہ نہ تو سپریم کورٹ کر سکتی ہے، نہ علماء کی کوئی کونسل [1]

باقی رہا معاصر کا یہ کہنا کہ "کوئی ایسا ادارہ متعین کیا جائے (مثلاً عدالت عالیہ) کہ کسی شخص کو مملکت کے کسی قانون کے کتاب و سنت کے مطابق ہونے میں شبہ ہو تو وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر آخری فیصلہ لے لے۔"

تو جہاں تک مدون شدہ مسلم پرسنل لاز کا تعلق ہے، ہماری عدالت ہائے عالیہ یہ فرض انجام دے رہی ہیں۔ (طلاق لعان اور خلع کے متعلق جسٹس کیانی اور جسٹس کیکاؤس کے فیصلے۔ ملک محمد جعفر کا مضمون) لیکن ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی رائے میں جیسے علماء کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی قانون کے کتاب و سنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں۔ اسی طرح کوئی عدالتِ عالیہ بھی اس اختیار کی حامل نہیں قرار دی جا سکتی۔ یہ حق اصولاً صرف اجماع کو حاصل ہے، اور صرف قانون ساز اسمبلی آج اس اجماع یا رائے عامہ کو قانونی شکل دے سکتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں:۔ "قانون سازی کا حق مطلق اجماع اور صرف اجماع کو حاصل ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حکمرانوں کے پاس قانون سازی کے اختیارات نہ تھے۔ قانون سازی اُمت من حیث المجموع کرتی تھی۔ البتہ حکمران اس کا نفاذ عمل میں لاتے تھے۔"

---

[1] ڈاکٹر صاحب کا مطبوعہ رسالہ، اسلامی حکومت اور قانون سازی۔